اقبال کا نظریۂ شاعری

(از خواجہ احمد فاروقی، دہلی کالج)

ایک تقریر جو رضا کالج رام پور میں یوم اقبال کے موقع پر کی گئی

اقبال کی شاعری نے اُس وقت ہوش کی آنکھ کھولی جب ہمارے قوائے عمل شل ہو چکے تھے، اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا، ہندوستان میں تا حدِ نظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا، مشرق آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اس کے خون سے مغرب میں شراب ناب بنائی جارہی تھی۔ خود مغرب، مادیت کے فریب میں گرفتار تھا اس کے حصّہ میں نہ لغزشِ مستانہ تھی، نہ آہِ بیتابانہ۔ ہر طرف تدبر کی فسوں کاری کارفرما تھی یا جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری جلوہ فرما

مشرق خراب، و مغرب ازاں بیشتر خراب عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجو

اس وقت ہندوستان ہی نہیں، تمام عالم مشرق ایک ایسے آتشیں فطرت، نوا سنج کے رجز ہائے امید افروز کے لئے گوش برآواز تھا، جو اس کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دے، جو ظلمتِ شب کے بعد صبح عید کی خبر دے اور جو اپنے نفسِ شعلہ بار سے سیماب کی سی بیتابی پیدا کر دے۔

قدرت نے یہ خدمت اقبال کے سپرد کی جس نے اپنے نفسِ گرم کی آمیزش سے الفاظ کے پیکر میں نئی روح پھونک دی اور اپنی معجز بیانی اور شعلہ بار آواز سے سارے مشرق کے نیستان کو آتشکدہ بنا دیا۔

اقبال کو مشرق کی ایسی متزلزل اور اقتدار باختہ اقوام کو مخاطب کرنا تھا، جن کے پاس بجز اوہام کے تار و پود کے اور کچھ نہیں تھا جن کے دل اور دماغ دونوں گرفتارِ طلسم تھے

جن کے جام و سبو میں گریۂ طفل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جو اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے بے خبر تھے، جن کے الفاظ بے جان اور بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اور جن کی شاعری افسوں و افسانہ سے زیادہ نہیں تھی ان کے ہنروروں کا تخیل عشق و مستی کو جنازہ تھا اور ان کے اندیشۂ تاریک میں پوری قوم کا مزار نظر آ سکتا تھا۔

اقبال کو جو کچھ کہنا تھا، وہ زمانہ کی زبان بندی اور اقوام کی زبوں حالی کے پیش نظر۔ نہایت اہم اور مشکل کام تھا۔ یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے سوزشِ جگر کے ساتھ دلِ باخبر اور اضطرابِ موج کے ساتھ۔ سکونِ گہر کی ضرورت تھی۔ پھر خیالات کا یہ خزانہ ہی کافی نہیں تھا اس کے اظہار کے لئے ایک نئے شاعرانہ نقطۂ نظر، ایک نئے اسلوب اور ایک نئے سانچے کی ضرورت تھی۔

اقبال نے خوابوں کے عظیم الشان محل تعمیر نہیں کئے اس نے تصورِ جاناں ہی کو اپنا سرمایہ حیات نہیں سمجھا اس نے ہمارے متاخرین شعرا کی طرح "حسن کی رسیلی شبنم کے جرعہ نوشیں سے پرورش نہیں پائی۔ اور خیالی جنت کی نہروں کا مصفا دودھ نہیں پیا" وہ اگر ستاروں سے آگے پرواز کا قائل ہے، تو اپنا ایک پیر زمین پر بھی استوار رکھنا چاہتا ہے سرود شعر کو بھی وہ خودی کی حفاظت سے الگ کرنا نہیں چاہتا۔ اور سنگ و خشت کے بجائے افکارِ تازہ سے اس جہانِ قدیم کی تخلیقِ نو کا آرزومند ہے وہ الفاظ و تراکیب کا سارا سرمایہ، خط و خال یا زلف و عارض کی تعریف و توصیف پر صرف کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کا خواہشمند ہے کہ ادبیات کے کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کیا جائے یا اس کہن روح کو تقلید کی بندش سے آزاد کر دیا جائے وہ نغمۂ خواب آور کو جائز نہیں رکھتا وہ تو ایسا نغمہ چاہتا ہے جو لالہ و گل کی آگ بھڑکا دے۔ وہ ایسا نفس چاہتا ہے جو حرارت و گداز میں اضافہ کر دے، وہ ایسے ادب اور شعر سے بیزار ہے جو حریم وجود میں خودی کی شمع کو روشن نہ کر سکے اس لئے کہ آرٹ کا تعلق زندگی سے کبھی بھی منقطع نہیں کیا جا سکتا اور زندگی دراصل اسی خودی کے سرور و سوز و ثبات کا نام ہے۔ اقبال آرٹ کو غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہے

وہ اس کے ذریعہ افسردہ رگوں میں زندگی کی برقِ تپاں دوڑانا چاہتا ہے۔ وہ اُس بادِ سحر کا قائل نہیں جس سے چمن افسردہ ہو اور نہ اُس قطرۂ نیساں کا جس سے دریا کا دل متلاطم نہ ہو۔

اقبال نے جب اپنے مخصوص رجز کی ترانہ سنجی شروع کی اس وقت امیر و داغ کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ اندازِ نگارش اقبال کے لئے فائدہ مند نہ تھا، حالی واکبر نے ایک نئی روش ضرور نکالی تھی لیکن اقبال کی پیاس اس جوئے کم آب سے کہاں بجھ سکتی تھی اس نے غالب کے خرمن سے خوشہ چینی کی اور بقول ڈاکٹر عبدالحق اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے لیکن حقیقتاً یہ میدان بھی اُس کی ہمت کے لئے کم تھا اس نے تمام اردو اور تمام فارسی شاعری کا جائزہ لیا اور اُس سے بہت سے علامات واشارات لئے اور اس میں بہت سے اپنی طرف سے اضافے کئے اس طرح مینائے کہن میں نئی شراب اُنڈیل کر اس نے اردو و فارسی شاعری کا رنگ و آہنگ ہی بدل دیا۔

اقبال کے نزدیک شاعری کا مقصد حقیقت طرازی ہے اگر اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو وہ ایک نشہ ہے لطیف لیکن مہلک۔ اس خیال کو اس نے جا بجا ادا کیا ہے:-

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اقبال دوسروں کے افکار و تخیل سے اپنی دوکان آراستہ کرنا نہیں چاہتا وہ خود اپنی نظر سے چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنی خودی تک پہنچنے کا آرزومند ہے۔ اپنے نورِ سحر سے آسمانوں کو روشن کرنے کے لئے مضطرب ہے:-

دیکھے تو زمانہ کو اگر اپنی نظر سے افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے

اقبال کے کلام میں جلال اور جمال دونوں کی خوبصورت آمیزش ہے وہ کہتا ہے وہ نغمہ کیا جو آتشناک نہ ہو، وہ شعلہ کیا جو سرکش و بیباک نہ ہو۔ اِس آئینۂ فطرت میں اگر شاعر یا مصور اپنی خودی نہیں دکھلا سکتا تو اس کی کوششیں بیکار اور مرگِ تخیل کے مترادف ہیں۔ اسی طرح وہ سرود کو کوئی اہمیت نہیں رکھتا جو ستاروں کو پگھلا نہ سکے، مغنی کا وہ زیر و بم بیکار محض ہے جو زندہ و پایندہ نہ ہو۔

وہ اہلِ ہنر جن کی خودی، غلامی کی تاثیر سے نرم ہو چکی زمین پر بوجھ ہیں اور قوم کے لئے زہر ایسے مرغانِ سحر جن کی نوا سے گلستان افسردہ ہو، وہ اگر خاموش ہی رہیں تو بہتر ہے اسی طرح ایسے فرہاد جو صرف کوہ کنی کے قائل ہیں اور دولت پرویز کو متزلزل نہیں کر سکتے ان کا وجود قوم کے لئے فائدہ مند نہیں، نقصان رساں ہے۔

اقبالؔ آرٹ کے مقابلہ میں ذوقِ نظر اور خلوصِ دل کے ساتھ محنتِ پیہم کا بھی قائل ہے اس کا خیال ہے کہ کوئی جوہر بغیر کوشش ناتمام کے ظاہر نہیں ہوتا۔ مے خانہ حافظ اور بت خانہ بہزاد خونِ رگِ معمار ہی سے وجود میں آتے ہیں۔

درحقیقت اقبالؔ شعر کو پیغامِ حیاتِ ابدی، نغمۂ جبرئیل اور بانگِ اسرافیل سمجھتا ہے۔ وہ حسن کو بجائے خود اہم نہیں سمجھتا بلکہ اس کو اظہارِ حقیقت کا ایک ذریعہ تصور کرتا ہے اس کے نزدیک یہ افادی چیز ہے اور اس کی اہمیت اسی وقت تک ہے جب تک کہ یہ زندگی سے ہم آہنگ ہے اور حقائق کی ترجمان۔ "ورنہ کف دریا سے زیادہ سبک" بے روح اور بے مصرف ہے۔ شاعر کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو نوعِ انسان کی خدمت کے لئے وقف کر دے اور انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کر دے۔ اقبالؔ اس نظریہ پر پوری طرح کاربند رہا ہے اور اس نے اپنے فرائض کو پوری گرمجوشی اور صناعانہ چابک دستی کے ساتھ ادا کیا ہے

اقبالؔ شاعرِ ماضی، شاعرِ حال اور شاعرِ مستقبل تینوں حیثیتوں کا جامع ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے شعر و ادب میں ماضی کے سرمایہ سے قطع نظر نہیں کیا، حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا اور مستقبل کے لئے وسعت پیدا کی یونان کے دیوتا جانس (Janus) کی طرح اس کا ایک رُخ ماضی کی طرف اور دوسرا مستقبل کی طرف ہے لیکن اس کا محمود اور ہے، ایاز اور، خُم اور، ساقی اور، ابراہیم اور نمرود اور، ہر تلمیح اور ہر تشبیہ میں اس کا ذوقِ نظر کارفرما ہے۔ ہر لفظ پر اس کا اپنا نقش موجود ہے بقول شخصے کوئی تشبیہ کوئی استعارہ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ، باقی نہیں جس کے اندر اقبالؔ نے اپنا پیام نہ رکھ دیا ہو" پھول کی پنکھڑی میں، کانٹے میں، دریا کی روانی میں، صحرا کے بگولوں میں

پہاڑ کی بلندی میں، مے خانہ کے خُم میں، ساقی کے ساغر میں، مغنی کے ساز میں، ہوا میں، آسمان میں، غرض کائنات کے ہر ہر ذرہ میں اس کے پیام کا پرتو موجود ہے" یہی وجہ ہے کہ ان حکیمانہ اسرار کو جب وہ لالہ وگل کے پردہ میں ادا کرتا ہے تو دل ودماغ اور قلب ونگاہ سب ہی جذب ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہی شاعری کا سب سے بڑا کمال ہے۔

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

تفسیر مظہری

تمام عربی مدرسوں، کتب خانوں اور عربی جاننے والے اصحاب کے لئے بیمثل تحفہ

ارباب علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف خصوصیتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گوہر نایاب کی تھی اور ملک میں اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔

الحمد للہ کہ

سالہا سال کی عرق ریز کوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان تفسیر کے شائع ہو جانے کا اعلان کر سکیں اب تک اس کی حسب ذیل جلدیں طبع ہو چکی ہیں جو کاغذ اور دیگر سامان طباعت وکتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں چھپی ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد جلد اول تقطیع ۲۲×۲۹/۸ سات روپے جلد ثانی سات روپے
جلد خامس سات روپے جلد ششم آٹھ روپے جلد ثالث ورابع زیر کتابت ہیں۔

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی